ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615
Vol. 7 No.1 2024

سوانح نگاری کا فن اور خرم سہیل

Art of Biography and Khurram Sohail

ڈاکٹر پروین اختر کلو
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر صائمہ اقبال
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
عائشہ مجید
ایم۔فل اسکالر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

Dr. Parveen Akhtar Kullu
Associate Professor, Department Urdu Govt college University, Faisalabad
Dr.Saima Iqbal
Assistant Professor,Department Urdu Govt college University, Faisalabad
Ayesha Mujeed
M.Phil scholar department Urdu, Govt college University, Faisalabad

Abstract:

The art of presenting the life circumstances of any famous person in detail in a book is called biography. Both the virtues and sufferings of a famous person are described in biographies. While Khurram Sohail has worked as a journalist, translator, researcher and writer, his work as a biographer has also come to the fore. Khurram Sohail's autobiography titled "Kalam sy Awaaz Tak". Raza Ali Abidi" was published in 2014. A detailed account has been recorded. Writing a biography is not an easy task, it requires a lot of hard work, it is a huge deficiency in our Urdu literature, authentic biographies of some great personalities of our literature are not available. Khurram Sohail has an interesting writing containing the forgotten memories of Raza Ali Abidi. In this book, he has written down the personal and public situations of the well-known prose writer of Urdu language, Raza Ali Abidi, and has made the subject of Abidi's stay in London. This article presented Khurram Suhail as "Biographer.

Key words:

Khurram Sohail, Biography, journalist, translator, researcher and writer, "Kalam sy Awaaz Tak". Raza Ali Abidi".

خرم سہیل کی ادبی حیثیت بطور سوانح نگار پرکھنے سے پہلے سوانح نگاری کے فن، معنی و مفہوم اور اوصاف کا جاننا ضروری ہے۔

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

سوانح عمری انگریزی کے لفظ "Biography" کے مترادف ہے، اصطلاح میں اُس صنف نثر کو کہتے ہیں، جس میں کسی فرد کے حالات زندگی اور شخصی کارنامے اس کی پیدائش سے لے کر وفات تک بیان کیے جائیں۔

سوانح عمری کسی بھی شخص کی گزاری گئی زندگی کی داستان ہوتی ہے۔ بہت سی معروف شخصیات نے اپنی سوانح عمری شائع کروائی اور انہیں کافی پذیرائی بھی حاصل ہوئی۔ شہاب نامہ سوانح عمری کی بہترین مثال ہے، جو کئی دہائیوں بعد بھی اسی طرح باذوق لوگوں کی پسندیدہ کتب میں شامل ہے۔ ایسے ہی کچھ اور لوگوں نے بھی مشہور شخصیات کی زندگی کے بارے میں لکھا ہے، جو عموماً ان معروف شخصیات کے کافی قریب ہوتے ہیں۔

سوانح حیات کے معانی حالاتِ زندگی کے ہیں۔

کسی بھی نامور شخص کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ ایک کتاب میں پیش کرنے کا فن سوانح کہلاتا ہے۔ سوانح میں کسی مشہور شخص کے محاسن اور مصائب دونوں بیان کیے جاتے ہیں۔

سوانح عمری میں مستند اور جامع مواد کی پیش کش ضروری ہوتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے کہ جس شخص پر سوانح لکھی جا رہی ہے، اس کی زندگی کے تمام کارناموں کو کتاب میں سلسلہ وار بیان کر دیا جائے۔ کتاب میں اگر صرف محاسن و کمالات بیان کیے جائیں، تو ایسی سوانح ادبی معیارات کی تکمیل نہیں کر سکے گی، سوانح عمری میں نہ تو شخصیت کے بارے میں فرضی واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی مبالغہ آمیز اسلوب۔

سوانح نگاری کا آغاز

اردو میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز 1886۔1887ء سے ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالی کو اردو کا اولین اور سب سے بہترین سوانح نگار کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے شیخ سعدی کی حیات پر حیات سعدی لکھی جس کی اشاعت 1989ء میں ہوئی۔ اس کے بعد مرزا غالب پر یادگار غالب اور آخر میں سر سید احمد خان پر حیاتِ جاوید لکھ کر اردو ادب میں سوانح نگاری کی بنیاد رکھی۔

اہمیت

سوانح عمری سے لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور اس سے افادیت بھی ہوتی ہے، مطلب ہمیں عظیم شخصیتوں کے متعلق معلومات ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ عظیم انسانوں پر عظمت کارنامے پڑھ کر ہمارے دلوں میں بھی ان جیسا بننے اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

سوانح کے لیے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے، جس نے سیاسی، سماجی، علمی یا ادبی سطح پر کوئی کارنامہ انجام دیا ہو، سب سے پہلے جس شخصیت کی سوانح لکھنا ہے، ان کی زندگی کے عام حالات، مخصوص کارنامے، ان کی خدمات سے متعلق مکمل تفصیلات یعنی پیدائش سے لے کر وفات تک کے ماخذات و حوالہ جات لکھتے ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی اپنی کتاب اصناف ادب میں لکھتے ہیں:

> "سوانح عمری وہ صنفِ ادب ہے، جس میں کسی فرد کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام واقعات، اس کی ذہنی و عقلی نشوونما کے مختلف مراحل اور اس کے شخصی کارناموں وغیرہ کو بہ تفصیل بیان کیا جائے۔"(1)

ایک غیر معروف معمولی اور گم نام انسان بھی سوانح نگاری کا موضوع بن سکتا ہے کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے انسان کی صحیح صورت کشی اور اس کے سفر حیات کی عکاسی بڑے سے بڑے انسان کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔

سوانح نگار کو بڑی مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کسی انسان کی صحیح مرقع کشی کے لیے سوانح نگار کو بیک وقت محقق، مورخ، مبصر، ماہر نفسیات اور ادیب ہونا چاہیے چونکہ ہر سوانح نگار میں ان اوصاف کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے دنیائے ادب میں اعلیٰ درجے کی سوانح عمریاں بہت کم ملتی ہیں، البتہ عظیم شخصیتوں کی نہایت ادنی سوانح عمریاں بہت زیادہ ہیں۔ حفیظ صدیقی سوانح عمری کے حوالے سے کشاف تنقیدی اصطلاحات میں لکھتے ہیں:

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

"عصر، نسل اور ماحول جیسے موثرات کے حوالے سے کسی شخص کی داخلی اور خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کا ایسا جامع، مفصل اور معروضی مطالعہ جو اس کی زندگی کے ارتقاء اور اُس کے ظاہر و باطن کو روشنی میں لا کر اس کی ایک ایسی قدآدم اور جیتی جاگتی تصویر پیش کر سکے جس پر کسی اور کی تصویر ہونے کا مطلق گمان نہ گزرے۔"(2)

سوانح عمری دراصل ایک شخص کی مکمل تاریخ ہے۔ سوانح عمری ناول کی طرح وسیع، تاریخ کی طرح سبق آموز اور شاعری کی طرح جمالیات سے آشنا ہوتی ہے۔ یہ کسی شخصیت کی زندگی کی تصاویر کا البم ہوتا ہے اور اسے ہر لحاظ سے مکمل ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم "سوانح نگاری کیا ہے؟" میں لکھتے ہیں:

"سوانح تاریخ کی ایک شاخ ہے، لیکن بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار ادب میں بھی کیا جاتا ہے۔ اب سوانح محض انسان کی پیدائش، خاندان تعلیم، مشاغل، زندگی اور وفات کا بیان ہی نہیں، بلکہ کسی فرد کے ظاہر و باطن، عادات و اطوار اخلاق و معاشرت وراثت اور نفسیاتی کیفیت اور اس کی زندگی کے لیے نشیب و فراز کی داستان بن گئی ہے۔ اب سوانح نگار کے لیے وہ تمام باتیں دلچسپی کا باعث ہیں، جس سے شخصیت کی تعمیر اور ایک مکمل تصویر کے بنانے میں مدد ملے۔"(3)

سوانح عمری لکھنے کے لیے محقق کے اندر چند اوصاف کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ سوانح نگار اپنے ہیرو سے جذباتی لگاؤ اور محبت رکھتا ہو، اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے ہیرو سے قربت بھی ہو، تاکہ اسے صحیح واقعات جمع کرنے میں آسانی ہو۔

۲۔ سوانح نگار کا اپنے ہیرو کی شخصیت کا مطالعہ یک رُخانہ ہو، بلکہ خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

۳۔ سوانح نگار کو ہیرو کے محاسن اور مصائب بیان کرتے ہوئے غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ نہ تو شخصیت کی خوبیوں کا بیان اس طرح ہو کہ مبالغہ لگے اور نہ ہی خامیوں کی بے جا پردہ پوشی کی گئی ہو۔

۴۔ سوانح نگار کو منتخب شدہ شخصیت کے واقعات کے معاملے میں صرف اُنہی واقعات پر بھروسہ کرنا چاہیے جو کہ مستند ہوں۔

ڈاکٹر صدف نقوی "گوہر ادب" میں لکھتی ہیں:

"سوانح نگاری کا فن ایک دشوار گزار پہاڑی سفر کی مانند ہے۔ کسی شخصیت کی سوانح لکھنا کرنا نہایت مشکل امر ہے کیونکہ سوانح عمری مصنف کے لیے ذریعہ فرار بھی بن سکتی ہے اور ذریعہ نجات بھی، اس لیے حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دل چسپی کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔"(4)

باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز حالی سے ہوتا ہے ان کے بعد شبلی کا نمبر آتا ہے یہ دو مصنف اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اردو سوانح نگاری کے امام اور ان کی سوانحی تصانیف اردو ادب کا ایک وقیع حصہ اور دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل اردو ادب کی سربلندی کا باعث ہیں۔

حالی اور شبلی کی سوانح نگاری عمریوں کا موازنہ کرتے ہوئے۔ سید شاہ علی سمجھتے ہیں کہ شبلی کے سامنے حالی کی مثال اور نمونے موجود تھے۔ حالی کی سوانح عمری حیات سعدی کے متعلق رقم طراز ہیں:

"حیات سعدی کا دیباچہ گویا اردو سوانح نگاری کا دستور العمل ہے اس میں مشرقی سیرت نگاری اور اس روایت، درایت اور مغربی سوانح نگاری اور اس کے طریقوں کے متعلق نہایت عمدہ اشارے ملتے ہیں، جن کو شبلی نے بعد میں وسعت دی۔"(5)

خرم سہیل بطور سوانح نگار

یہاں ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں کہ خرم سہیل جہاں صحافی، مترجم، محقق و مدون کام کر چکے ہیں، وہیں بطور سوانح نگار بھی ان کا کام منظرِ عام آچکا ہے۔

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

خرم سہیل کی لکھی ہوئی سوانح عمری بعنوان "قلم سے آواز تک۔رضا علی عابدی" ہے،جو 2014ء میں شائع ہوئی تھی،اس میں خرم سہیل نے مشہور معروف نثر نگار رضا علی عابدی کے حالاتِ زندگی اور ان کے علمی وادبی کارناموں کا مفصل احوال درج کیا ہے۔سوانح حیات لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے اردو ادب میں یہ ایک بہت بڑی کمی رہ گئی ہے ہمارے ادب کی بعض عظیم شخصیات کی مستند سوانح عمریاں بھی دست یاب نہیں ہیں۔

خرم سہیل نے نہایت عمدہ اسلوب کے ساتھ اس سوانح عمری کو پائے تکمیل تک پہنچایا۔ویسے بھی جتنا بڑا ادیب ہوتا ہے اس پر کچھ لکھنا بھی اُتنا ہی مشکل ہوتا ہے کیونکہ لوگوں کی توقعات بھی ویسی ہوتی ہے کہ جیسا ادیب ہے ویسا ہی سوانح حیات لکھنے والا بھی لکھے۔خرم سہیل کے لیے بھی اس کتاب پر کام کرنا نہایت مشکل رہا۔ایک تو اُن کو لوگوں کی توقعات پر پورا اُترنا تھا دوسرا وہ اپنے کام کے ساتھ ایمانداری سے چلا رہے تھے اس سلسلے میں انہوں نے بہت سی لائبریریاں کنگالیں اور رضا علی عابدی صاحب سے بھی ملاقاتیں کرتے رہے۔

رضا علی عابدی سے پہلی بار آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں دسمبر 2010ء کو عالمی اُردو کانفرنس میں ملاقات ہو،اس وقت خرم سہیل اپنی کتاب ''سرمایا'' پر کام کر رہے تھے خرم سہیل نے انہیں چائے پینے کی پیشکش کی،جسے انہوں نے نہایت شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قبول کیا۔چائے کی پیالی ختم ہونے سے پہلے خرم سہیل اس کتاب کو لکھنے کا ارادہ کر چکے تھے،مگر جب خرم صاحب تحقیق کرنے نکلے،تو پتا چلا کہ ہمارے ہاں بے سروسامانی صرف اخلاقی طور پر ہی نہیں بلکہ علمی طور پر بھی ہم تقریباً فارغ ہو گئے ہیں۔

خرم سہیل کی ''رضا علی عابدی'' کی بھولی بسری یادوں پر مشتمل دلچسپ تحریر ہے۔انہوں نے اس کتاب میں اُردو زبان کے معروف نثر نگار رضا علی عابدی کے نجی و مجلسی حالات قلمبند کیے ہیں،عابدی صاحب کے قیام لندن کے زمانے کو موضوع بنایا ہے کیونکہ عابدی صاحب ملازمت کے سلسلے میں 1972ء میں برطانیہ چلے گئے تھے اور بی بی سی اردو لندن میں اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ زیرِ نظر شخصیت کے متعلق ہمدردانہ رویہ اپنائے۔شخصیت کے نہ تو بہت زیادہ عیوب و قبائح گنوائے جائیں کہ متعلقہ شخصیت ایک منفی شخصیت کے روپ میں سامنے آئے اور قاری کے قلب و ذہن پہ منفی اثرات مرتب ہوں اور نہ ہی اس کی اچھائیوں اور خوبیوں کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے کہ وہ شخصیت انسان کم اور فرشتہ زیادہ محسوس ہو اس لیے ایک متوازن و متعدل شخصیت کا پیش کرنا سوانح نگار کے لیے لازم ہے۔

اگر کتاب اور آواز کو یکجا کر کے کوئی نام تخلیق کیا جائے تو وہ صرف ایک ہی نام بنتا ہے جیسے ہم رضا علی عابدی کہتے ہیں۔اس کتاب کا دیباچہ انتظار حسین نے لکھا۔

رضا علی عابدی کے والد سید اکبر علی کا براہِ راست تعلق ریاست شمس آباد کے نوابین سے تھا۔یہ رشتے داری صرف یہیں تک محدود نہیں تھی،بلکہ ریاست شمس آباد کے نوابین کے مراسم ریاست اودھ کے حکمرانوں سے بھی تھے۔ریاست شمس آباد کے نواب ''سید عنایت علی خاں'' ریاست اودھ کے سلطان امجد علی شاہ کے ماموں تھے۔عابد صاحب اپنے خاندانی پس منظر کو نہایت شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

> ''میرے گھرانے میں والد سے لے کر سب سے چھوٹے بھائی تک سب کسی نہ کسی قسم کے انجینئر ہیں۔میری تینوں بزرگ بہنیں،خدا انہیں جنت نصیب کرے بھائیوں کی چکنی چکنی ہتھیلیوں کو سہلا سہلا کر کہا کرتی تھیں۔ہمارے خاندان کا شمار اہلِ قلم میں ہوتا ہے اہلِ سیف میں نہیں۔''(6)

رضا علی عابدی کے بزرگ اہلِ قلم تھے تو وہ خوبی سید اکبر علی خلف سید شوکت علی خان صاحب خلف سید کرامت علی خاں تک ورثے میں پہنچنے کی اطلاع ہم تک نہیں پہنچی،البتہ ان کے والد نواب معین الدین الدولہ بہادر ناصر الملک سید عنایت علی خاں کے قلم کی کرامات کے بارے میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ سلطان امجد علی شاہ بہادر بادشاہ اودھ کے ماموں بھی تھے اور وزیر بھی۔اسی مناسبت سے کچھ نہ کچھ لکھتے ضرور تھے۔

خاندان کا شجرہ نسب

سید اکبر علی (رضا علی عابدی کے والد)

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

سید شوکت علی خاں (دادا)

نواب سید کرامت علی خاں (پردادا)

نواب سید عنایت علی خاں (جو امجد علی شاہ کے وزیر اور ماموں تھے)

نواب سید منعم خاں بہادر

نواب سید ابوالمکارم خاں بہادر

نواب کامیاب خاں بہادر

نواب سید جاں نثار خاں بہادر

آباؤاجداد اور خاندان

رضا علی عابدی کا خاندان ایران سے منتقل ہو کر لکھنو آیا تھا، ان کا ننھیال پیشے کے اعتبار سے ''جوہری'' اور ددھیال ''سوداگر'' تھا خاندانی سلسلہ نسب ریاست اودھ کے نوابین سے تو ملتا ہی ہے ان کے علاوہ کئی خاندان رشتے دار سلطنت دہلی میں بھی اعلیٰ وزارتوں پر فائز رہے، مگر اس تعلق خاص کا ذکر رضا علی عابدی صاحب نہیں کرتے۔ ان کے والد بھی ان رشتوں کا تذکرہ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ عابد صاحب کے والد سے جب لکھنو کے دوست احباب، شاہی خاندان کے تعلق کے بارے میں پوچھتے، تو ان کا ایک ہی جواب ہوا کرتا'' پدرم سلطان بود'' میرے والد بادشاہ تھے اور میں کیا ہوں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

عابدی صاحب کے دادا کا نام نواب شوکت علی جبکہ نانا کا نام سید محمد یوسف تھا۔ والد کا نام سید اکبر علی تھا، لیکن پیار سے ان کو پیارے صاحب کہا جاتا تھا۔ والدہ کا نام محمودہ بیگم تھا۔ والد صاحب کی دو شادیاں تھیں محمود بیگم سے آٹھ بچے پیدا ہوئے اور عابدی صاحب ساتویں نمبر پر تھے عابدی صاحب کے والد کو لکھنا کا بہت شوق تھا، لیکن ان کے بچوں میں سے صرف عابدی صاحب لکھنے والے نکلے اور پھر عابدی صاحب نے بھی ایسا لکھا کر خطے کی تاریخ، جغرافیہ، عوام الناس سب سمٹ کر عابدی صاحب کی تحریروں میں آگیا۔ آنے والی نسلیں عابدی صاحب کی کتابوں کے ذریعے اپنے روشن اور شاندار ماضی سے متعارف ہوتی رہیں گی۔

لکھنوں کے زوال کا دکھ

رضا علی عابدی کے والد 7 جولائی 1884ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے، یہ ایک روشن تہذیب کے نمائندہ فرد اور وہ شخص بھی تھے۔ جنہوں نے انگریزی سرکار کی حکومت کو قریب سے دیکھا ان کا خاندانی پس منظر شاہی تھا، لیکن انہوں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی سابقہ لاحقہ نہیں لگایا بلکہ وہ نہایت سادہ طرز حیات کو ترجیح دیتے تھے۔ جب لکھنو کا زوال دیکھا، تو انہوں نے نے آباؤاجداد کی کہانیاں اور ان کے شاہی کردار یکسر فراش کر دیئے اور اظہار تکلم پر خاموشی کا قفل ڈال دیا۔ یہ خاموشی نسل در نسل منتقل ہوئی عابدی صاحب نے بھی کبھی کھل کر اس شاہی منظر نامے کا ذکر نہیں کیا۔

رضا علی عابدی کی درست تاریخ پیدائش

اب تک عابدی صاحب کی پیدائش کی تاریخ غلط ہی لکھی جاتی رہی، وہ بتاتے ہیں:

> ''میری تاریخ پیدائش 30 نومبر 1936ء لکھی جاتی ہے، یہ غلط ہے مجھے یاد ہے، میں چھوٹا سا بچہ تھا اور میرے پرائمری اسکول کے استاد مجھے پڑھانے آتے تھے۔ یہ بات 1966ء کی ہے میں ہائی سکول میں داخل ہونے لگا، تو اس کے لیے داخلے کا فارم بھرا گیا۔ اس میں جو تاریخ پیدائش لکھی جاتی ہے وہ عمر بھر ساتھ چلتی ہے۔۔۔ ابی باجی کی شہادت کے مطابق میری تاریخ پیدائش یکم شعبان 1353 ہجری بمطابق 9 نومبر 1934ء ہے۔''(7)

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

خرم سہیل صاحب نے بہت ہی عمدہ انداز میں رضا علی عابدی کو ایک ہیرو کی صورت میں پیش کیا ہے۔ رضا علی عابدی اپنے بھائیوں کے لیے فخر ہے ان کے بھائیوں کے ساتھ عابدی لگا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اکثر لوگ کہتے، آپ رضا علی عابدی کے بھائی تو نہیں ہیں؟ عابدی صاحب کے بڑے بیٹے جب امریکا کسی کام کے سلسلے میں گئے تو وہاں ان کے پاکستان پڑوسیوں نے میرا نام لینے سے فوراً پہچان لیا عابدی صاحب اپنے خاندان والدین اور بہن بھائیوں کے لیے ایک روشن ستارہ بن کر ابھرے۔

رضا علی عابدی کا دوسرا دور (1951ء سے 1957ء)

خرم سہیل بتاتے ہیں عابدی صاحب کا یہ دور قلم تھامنے سے شروع ہوتا ہے اور اپنے خیالات قلم بند کرنے تک کا ہے خرم سہیل نے عابدی صاحب کے مطالعے کا رجحان کو بہت ہی شاندار انداز میں بیان کرتے ہوئے بتایا کہ عابدی صاحب کی شخصیت میں، سب سے بڑی خوبی "چیزوں کا بغور جائزہ لینا ہے، یہی وجہ ہے، ان کی تحریروں میں قوت مشاہدہ کی بدولت جیتا جاگتا برصغیر دکھائی دیتا ہے ان کے ہاں چیزوں کو غور سے دیکھنے کی صلاحیت نے ان کی تخلیقات کو چار چاند لگا دیئے۔"

عابدی صاحب بچپن سے ذہین نونہال اور ہونہار طالب علم تھے انہوں نے اپنے عہد کے سب بڑے اخبار پڑھے ہے۔ عابدی صاحب کے بچپن میں بچوں کی تربیت کا بنیادی وصف مطالعہ ہوتا تھا کتاب خریدنا اور پڑھانا تہذیبی علامت سمجھا جاتا تھا۔ خرم سہیل خوبصورت انداز میں عابدی صاحب کا اقتباس تحریر کرتے ہیں:

> "تب ٹی وی نہیں تھا، صرف ریڈیو تھا اور کتاب معلومات کا سب سے بڑا وسیلہ تھا۔ ہر محلے میں دو تین لائبریریاں ہوتی تھیں۔ ان میں اردو کی ہر اچھی کتاب رکھی ہوتی تھی۔ دو آنے روز کرایے پر ملتی تھی تین دن میں پڑھ کر لوٹا دیا کرتے تھے۔"(8)

رضا علی عابدی نے اپنی زندگی میں مسلسل کتابیں پڑھیں جو کچھ پڑھا اس کے لیے ان کا نقطہ نظر بہت واضح رہا۔ ان کی مطالعہ کی عادت بچپن سے لے کر آج تک برقرار ہے مصنف اور تصنیف دونوں کو بغور پڑھتے ہیں۔

خرم سہیل صاحب بتاتے ہیں عابدی صاحب سونے سے پہلے خوشگوار تحریریں پڑھنا چاہتے ہوتے ہیں، عابدی صاحب کہتے ہیں:

> "میں روشنی اور خوشبو پڑھنے کا خواہش مند ہوں، جی چاہتا ہے، میرے سامنے کھلی ہوئی کتاب سے تتلیاں اُڑیں، کرنیں پھوٹیں تازہ تازہ کٹی ہوئی گھاس کی مہک اُٹھے۔۔۔ اور کچھ نہ ہو تو ایک چھوٹے سے بچے کی چہکار سنائی دے۔"(9)

تقسیم ہند کے بعد جب ہجرت کر کے پاکستان جانے کا فیصلہ ہوا، تو عابدی صاحب کا تمام جمع شدہ ذخیرہ، جس کو یہ "میرا دارالمطالعہ" کہتے ہیں ردی والے تول کر گئے۔ لیکن عابدی صاحب کا ہنر کوئی ان سے نہیں لے سکا، اچھی تحریروں کو پڑھنا اور لکھنا ان کا مشغول رہا۔ عابدی صاحب نے قلم کے ذریعے کئی دہائیوں کی یادیں متصور کی ہیں۔ عابدی صاحب نے بچپن سے لکھنا شروع کیا یہ صلاحیت والد کی طرف سے ان میں آئی تھی۔

خرم سہیل بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے لکھنے کی ابتدا روزنامہ جنگ سے کی اور صحافت کے شعبے میں پہلی ملازمت کا آغاز بھی یہیں سے کیا۔ انہوں نے روزنامہ انجام، روزنامہ امروز اور روزنامہ احسان میں بھی لکھا اور روزنامہ جنگ میں بچوں کے صفحے پر بہت جم کر لکھا۔

عابدی صاحب نے بہادر یار جنگ اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا، وہاں سے گریجویشن کی سند حاصل کی اور پھر مکمل طور پر صحافت کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ خرم سہیل نے عابدی صاحب کے بچپن کی یادوں کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے:

> "عابدی صاحب نے بچوں کے لیے ماہنامہ کھلونا، میں لکھنے کا ارادہ کیا اور اس رسالے کے ایڈیٹر ادریس دہلوی، یونس دہلوی کو اپنی تحریر بھیجی۔ انہوں نے اس کو نہ چھپایا وہ بھی جیسے قسم کھائے بیٹھے تھے۔ یہ سن پچاس کی بات ہے کہ شفیق الرحمان کی حماقتیں ہاتھ لگی میں نے جھٹ اس میں سے ایک لطیفہ نقل کیا اور مدیرانِ کھلونا کو بھیج دیا۔ وہ اسی مہینے شائع ہو گیا۔"(10)

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

عابدی صاحب کے بچپن نے 1951ء کی سیڑھی پر جب قدم رکھا تھا عابدی صاحب کی ملاقات ایک ناشر سے ہوئی جو بچوں کی کتابیں بڑے شوق سے چھاپا کرتا تھا۔ عابدی صاحب بھی اپنی پہلی کتاب کا مسودہ لے کر گئے اس کی پذیرائی ہوئی اور چند ہی روز میں ''ادبی بک ڈپو'' کے زیرِ اہتمام ان کی پہلی کتاب بازار میں آگئی اس حوالے سے عابدی صاحب بتاتے ہیں:

> ''ادبی بک ڈپو والوں نے مجھ سے کہا۔ کیا تم ٹارزن کی کہانیاں لکھ سکتے ہو؟ میرے پاس تو ٹارزن کے بہت سے کامک جمع تھے میں نے خوش ہو کر گردن کو جنبش دی، پھر تو میرے قلم کی ایسی جنبش ہوئی کہ میری کتابیں جنہیں کتابچے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ متواتر چھپنے لگیں اور مجھے پہلی کتاب کے معاوضے کے طور پر ایک ایک روپے کے دو سکے ملے۔''(11)

رضا علی عابدی 1951ء میں پہلی مرتبہ روزنامہ جنگ کی نونہال لیگ کے ممبر بنے۔ ان کا ممبر شپ نمبر 260 تھا عابدی صاحب کے ہم عصر نونہال لکھاری محمد جنید شبلی، وکیل احمد، عبدالستار، امیر علی فدا حسین بھائی، شاہ مہر عالم، عزیز احمد، اقبال میاں، مجید احمد، منیر خان کانپوری، نسیم الدین قریشی ہیں۔

اور وہ نام جو عابدی صاحب کے ساتھ روزنامہ جنگ کے صفحات پر 1951ء سے 1953ء تک شائع ہوتے رہے ان میں غازی صلاح الدین نعیم آروی، عبدالرشید ناصری، پرویز نیازی، رشید جاوید، رضیہ سلطانیہ اطہر حسین دیگر شامل تھے۔ عابدی صاحب کے ہم عصروں میں یوں تو بہت سے لوگ تھے، مگر ان کے دوست غازی صلاح الدین جو صحافت سے وابستہ ہیں، جو بچپن کے دوست بھی ہیں۔ عابد صاحب کہتے ہیں:

> ''کاش دوستی سے بڑھ کے کوئی اور لفظ ہوتا، تو شاید وہ ہمارے تعلق کی سچائی، خلوص اور پختگی کو بیان کر پاتا۔''(12)

روزنامہ جنگ میں عابدی صاحب اپنی کہانیاں ماہنامہ بھائی جان میں شائع کرواتے تھے۔ ان کے ساتھ اس وقت معروف ادیب میں بچوں کے لیے خصوصی طور پر لکھ رہے تھے، جن میں سے چند ایک ناموں میں مولانا عبدالمجید سالک۔ آقا بیدار بخت خان، قتیل شفائی، اویس احمد ادیب، مولانا ماہر القادری، سیف الدین سیف، مرزا ادیب، شورش کاشمیری جیسے اعلیٰ پائے کے قلم کار شامل تھے۔

خرم سہیل بتاتے ہیں کہ شفیع عقیل کا عابدی صاحب کی زندگی میں ایک نمایاں کردار ہے عابدی صاحب کی پہلی تحریر بھی انہیں کے ہاتھوں سے شائع ہوئی خرم سہیل نے شفیع عقیل سے بات کرتے ہوئے پوچھا کہ عابدی صاحب کے افسانہ نگاری کے حوالے سے آپ کا کیا موقف ہے، انہوں نے کہا ضروری نہیں ہوتا کہ انسان جو کام بھی کرے، اس کو توجہ ملے میری 44 کتابیں ہیں، مگر سب پر بات نہیں ہوتی چند ایک کتابوں کا ذکر ہوتا ہے۔ عابدی صاحب نے شفیع عقیل کے انتقال کے بعد روزنامہ جنگ میں شفیع عقیل مرحوم کے لیے ''نہیں''، ''میں شفیع عقیل ہوں'' کے عنوان سے کالم لکھا:

> ''پورے باسٹھ سال ہوئے میں اپنی پہلی لکھی ہوئی کہانی لے کر اخبار جنگ کے دفتر پہنچا، وہاں بہت سے دروازے تھے ایک دروازے پر لکھا تھا۔ بھائی جان اس وقت داخل ہونے سے پہلے دستک دینے کی تمیز نہیں تھی میں دروازہ کھول کر اندر گیا وہاں ایک جوان بیٹھا تھا اس نے بھی میری دستک نہ دینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا، میں نے اپنا کاغذ اس کو دیتے ہوئے کہا، میری یہ کہانی چھاپ دیجئے، اس نے کاغذ لے لیا اور مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے پوچھا۔ کیا آپ بھائی جان نہیں؟ جواب ملا نہیں، میں شفیع عقیل ہوں۔''(13)

خرم سہیل کو اس تحقیقی کام کو سرانجام دینے میں چند مشکلات بھی سامنے آئی وہ مختلف لائبریریاں میں گئے جو ویران پڑی ہیں، جو لوگ اس کام کو جانتے سمجھتے تھے وہ بھی تعاون نہیں کر رہے تو ان کو اس بات کا بھی بہت دکھ ہوا لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی تحقیق کو جاری رکھا عابدی صاحب کی زندگی کے ہر پہلو کو کھوج کر اس کتاب میں لکھا۔ خرم سہیل کہتے ہیں عابدی صاحب کا زمانہ بہت اچھا تھا جب لوگ اپنے دل اور کتب خانوں کے دروازے کھول دیا کرتے تھے

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

عید اور خون

ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے دروازے سے بوری ہٹی اور سلیم عید گاہ کی جانب روانہ ہوا۔ لمبی چوڑی کشادہ سڑکوں سے ہوتا ہوا۔۔۔ گزرے ہوئے زمانے کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس وقت، اس سے بہت دور تھا۔ آج ہر کوٹھی پر تین یا چار بکرے قربانیوں کے لیے کھڑے تھے اور سلیم کی جھونپڑی میں؟ انسانی زندگی ان بکروں جیسی تھی۔

آج اس کی حالت پر کوٹھیوں کی کھڑکیوں سے بچے قہقہے لگا رہے تھے کیونکہ وہ میلے پھٹے ہوئے کپڑے پہنے تھا۔ آج اس کے کپڑوں پر عطر نہیں ہے۔ آج اس کی جیبوں میں عیدی نہیں ہے۔ سلیم رونے لگا، اب اس کی ہمت نہیں تھی کہ وہ منہ اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھ سکے ایک بار اس نے آسمان کی طرف منہ اُٹھایا۔ اس نے سنا تھا کہ آسمان پر خدا رہتا ہے۔ وہ اپنے خدا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا منہ دیکھ کر ایک بار پھر سے ان کھڑکیوں سے قہقہے بلند ہوئے۔ اس بے خودی کے عالم میں، وہ فٹ پاتھ سے اُتر کر سڑک پر چلنے لگا۔

اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ سڑک پر آگیا لوگ ہنستے ہوئے موٹروں کو چلا رہے تھے ایک موٹر کا ہارن بجا اور سلیم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کچھ دیر بعد سلیم خون میں لت پت پڑا تھا ایک صاحب مسکراتے بولے سڑک پر چلنا نہیں آتا تو نکلے کیوں تھے۔ سلیم کی آنکھوں میں آنسو نکلے اور اس کے خون میں شامل ہو گئے کچھ لوگوں نے اس پہچان کر اس کی جھونپڑی تک پہنچا دیا۔ اس جھونپڑی سے آج خون بہہ رہا تھا۔

لوگ نماز سے فارغ ہو کر گزر رہے تھے انہوں نے اس خون کو دیکھا تو کہنے لگے کتنے دھوکے باز ہے جھوٹ بولنے میں ماہر ہے کل اسی جھونپڑی والوں کا لڑکا کمبل لینے والوں کی لائن میں کھڑا تھا خود کو غریب بتا رہا تھا اور آج انہوں نے بکرا قربان کیا ہے۔ کتنے جھوٹے ہیں؟ انسانیت کا خون اب بھی بہہ رہا تھا۔۔۔

عابدی صاحب کا تیسرا دور (1957ء سے 1972ء) تک کا ہے۔ عابدی صاحب نے اپنی صحافتی زندگی پر ''اخبار کی راتیں'' جیسی شاندار کتاب لکھی جس میں انہوں نے اخبارات میں گزارے ہوئے برسوں کو لکھا ہے۔ عابدی صاحب نے مختلف اخبارات میں کام کرنے کے زمانے کو قلم بند کیا، جس میں انہوں نے قارئین کو اپنی داستان، حیات سنانا مقصود نہیں، بلکہ اس وقت کی صحافت کی کہانی بیان کی ہے۔ عابدی صاحب خود بھی اس کتاب کو لکھنے کا مقصد بتاتے ہیں:

> ''میں نے نوجوانی میں صحافت یا میڈیا کی دنیا میں قدم رکھا ظاہر ہے میں اس میدان میں تنہا نہ تھا۔ میرے بہت سے ساتھی جو اہلِ قلم بھی تھے۔ ان میں سے ایک دو کے سوا کسی نے اپنے وقت، دور اور حالات کو تحریر کی صورت میں محفوظ نہیں کیا۔ اس میں کسی کا قصور بھی نہیں۔ کیونکہ اس وقت ایسا کوئی چلن بھی نہیں تھا کچھ نامور لوگوں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے۔''(14)

خرم سہیل نے عابدی صاحب کی صحافتی زندگی کو پانچ مرحلہ میں بیان کیا ہے:

روزنامہ جنگ۔۔۔ کراچی

روزنامہ جنگ۔۔۔ راولپنڈی

روزنامہ حریت۔۔۔ کراچی (فخر ماتری)

روزنامہ مشرق۔۔۔ کراچی

روزنامہ حریت۔۔۔ (محمود ہارون، یوسف ہارون)

عابدی صاحب یوں تو صحافت میں اپنا کیریئر بنا چکے تھے لیکن ایک لکھاری ان کو اندر سے تنگ کرتا تھا وہ اپنے لکھنے کا کام تو بچپن سے ہی شروع کر چکے تھے۔ اب انہوں نے پاک بھارت رپورٹنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا وہاں انہوں نے خوب دھوم مچائی اور 65 کی جنگ کے متعلق اردو ڈائجسٹ نے کہانیوں کا ایک مقابلہ کروایا تھا، انہوں نے ی کہانی اس مقابلے کے لیے لکھ کر بھیجی یہ الگ بات ہے، یہ کہانی سفر نامے کے انداز میں لکھی اس کہانی کو پڑھتے ہی اس کے سحر میں کھو جانا ایک فطری بات ہو گئی تھی یہ کہانی پنکھڑیاں کے نام سے تخلیق کی خرم سہیل نے اس کہانی کو اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

عابدی صاحب نے روزنامہ جنگ کے لیے کالم نویسی کا آغاز بھی نومبر 2012ء میں کیا عابدی صاحب کا کالم ہر جمع کو "دوسرا رخ" کے نام سے چھپتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے وقت اشاعت تک جن موجوعات کو قلم بند کیا:

- پردہ پوشی کا چلن
- قیامت میں جینے کا ہنر
- جلوس ایسے بھی ہوتے ہیں
- محلہ مولویانہ کی افسانہ نگار
- آندھیوں نے آنا چھوڑ دیا ہے
- بچی کے پاؤں چومنے کی خواہش
- باہر کیچڑ بہت ہے
- یوٹیوب ممنوع ہے عشق ممنوں جاری
- نہ ویسا کھانا رہا نہ ویسے کھانے والے
- نقل کرنے کو بھی ہنر چاہیے
- جب ترقی دیکھ کر دل دُکھتا ہے
- ایک شہر ایسا بھی ہے

رضا علی عابدی کے کالموں کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ہر نئے کالم میں ایک نیا موضوع سپردِ قلم ہوتا ہے۔ خرم سہیل ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد بتاتے ہیں ان کی تحریروں میں سفر نامے سے لے کر مشاہدے تک سب کچھ ملتا ہے جس کی وجہ سے عابدی صاحب ہمیشہ ہی قارئین کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔

خرم سہیل اپنی تحقیق کے بعد بتاتے ہیں کہ عابدی صاحب کی صحیح شناخت ریڈیو کے مائیکروفون سے ہوئی ہیں اخبار کی ڈیسک پر پندرہ برس بیٹھے رہے لیکن کسی گنتی میں شمار نہیں ہوتے ریڈیو نے ان کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا پھر انہوں نے قریہ قریہ گاؤں گاؤں شہر شہر لوگوں سے ملاقاتیں کیں پھر سفر ناموں کو کتابی صورت میں قلم بند کیا جس کے اندر داخل ہونے کے بعد ہمارا شاندار ماضی سامنے کھل کر آجاتا ہے۔

چوتھا دور (1972ء سے 1996ء) کا ہے

یہ دور بی بی سی اردو سروس کی نشریات کا آغاز تھا یہ ریڈیو کا دور تھا اس وقت ریڈیو سے دلچسپی کا کیا عالم تھا عابدی صاحب اس کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

> "اس وقت یہ عالم تھا کہ ہر گھر میں ریڈیو موجود تھا۔ عرب ممالک سے آنے والے ہر شخص کے ہاتھ میں ٹرانسٹر ریڈیو ہوتا تھا۔ جس پر بعد میں غلاف چڑھا دیا جاتا تھا اس غلاف میں جہاں گنجائش ہوتی لپکا گوٹہ ٹانک دیا جاتا۔ اسے گھر کے سب سے اونچے محان پر رکھا جاتا تاکہ بچے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں اور اس کی سوئی جو بڑے جتن کر کے بی بی سی پر لگائی گئی ہے وہ اپنی جگہ سے سرک نہ جائے۔۔۔ سارے گھر والے اس کے گرد بیٹھتے۔ بعض اوقات پاس پڑوس اور محلے والے بھی آ جاتے اور سارا مجمع چپ سادھ کر لندن سے آنے والی خبریں سنتا۔"(15)

بی بی سی میں ملازمت کرنے کا خیال عابدی صاحب کے دل میں آیا تو انہوں نے اخبار کے ذریعے ایک تربیتی کورس کے سلسلے میں برطانیہ گئے۔ یہ ملک ان کو اچھا لگا، تو واپس آکر اپنے اخبار کے دوست "اطہر علی" جو بی بی سی میں ملازمت کر رہے تھے، ان کی معاونت سے بی بی سی میں ملازمت کے لیے درخواست دی، کئی مشکلات کے بعد کامیاب ہو گئے۔ عابدی صاحب کوزے میں دریا کو یوں بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

"جب میں ریڈیو کی دنیا میں قدم رکھا اور ہماری تربیت شروع ہوئی تو پہلے پہل یہ گر سکھایا گیا کہ اپنی آواز سے محبت کرو، لیکن حقیقی تربیت گزرتے ہوئے وقت نے کی اور مجھے جو گر سکھایا، وہ میں نے عمر بھر کے لیے گرہ سے باندھ لیا اور وہ یہ کہ اپنے سننے والوں سے محبت کرو۔"(16)

ریڈیو کی ملازمت کے دورانیے میں جتنے پروگرامز کیے ان میں سے چند نام درج ہیں:

- انجمن
- شاہین کلب
- نوجوان کیا کہتے ہیں
- جہاں نما
- سیر بین
- شب نامہ

ان میں سے چار پروگرامز، کتب خانہ، جرنیلی سڑک، شیر دریا اور ریل کہانی کو کتابی شکل بھی دی گئی عابدی صاحب نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران تقریباً 13 پروگراموں کو سامعین کے لیے پیش کیا۔ ان سب پروگراموں کی تفصیلات انہوں نے مختصر طور پر "ریڈیو کے دن" میں لکھیں۔

خرم سہیل نے اپنی کتاب میں عابدی صاحب کا ہزارویں پروگرام کا اسکرپٹ بھی پیش کیا ہے جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے عابدی صاحب کی زبان کتنی سادہ سلیس اور آسان ہے۔ اس کے علاوہ اتوار کے اتوار اور سب رس، نوجوان کیا کہتے ہیں، دولت کی بھول بھلیاں، جہاں نما، سیر بین، شب نامہ تھے یہ مختلف نوعیت کے پروگرام تھے۔ عابدی صاحب نے اپنی زندگی کے 35 برس بی بی سی کو دے دیئے، مگر اس کے صلے میں بی بی سی نے انہیں کھلا میدان دیا، مواقع دیئے، جن سے وہ رضا علی عابدی بنے۔

پانچواں دور (1969ء سے 2013ء تک)

اس میں ہمیں عابدی صاحب کے سفر ناموں کی داستان اور حیرت انگیز دنیاؤں کا تذکرہ ملتا ہے خرم اپنی تحقیق کے مطابق کہتے ہیں عابدی صاحب کا پہلا سفر نامہ کتابی شکل میں شائع نہ ہوا۔ یہ 1968ء میں تین ماہ کا کورس مکمل کرنے انگلستان گئے تھے، وہاں انہوں نے تربیت حاصل کرنے کے بعد یورپ کی سیاحت کا فیصلہ کیا، اسی غرض سے فرانس، جرمنی اور سوئزرلینڈ کی سیاحت کی اور اسے قلم بند کیا، یہ سفر نامہ روزنامہ حریت میں جمعہ کے میگزین میں چھ اقساط میں لکھا۔ اس کی دھندلی سی یادیں عابدی صاحب کے ذہن میں رہ گئی تھیں۔ خرم سہیل نے بطور محقق اس کو تلاش کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت لگادی۔ خرم سہیل نے راقمہ کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا:

"اس کے لیے کراچی کی ساری بڑی لائبریریاں چھان ماریں، مگر کچھ نہ دستیاب ہوا۔ اس کے لیے دن رات کام کرتے ہوئے ان کی آنکھوں کی بینائی پر اثر پڑا، جس کی وجہ سے وہ آج تک دوائی کھا رہے ہیں لیکن یہ تو شکر ہوا کہ روزنامہ حریت اس وقت اخبار ڈان کی ملکیت تھا، اس وجہ سے اس کے پرچے محفوظ رہ گئے پھر میری درخواست پر ان تاریخی پرچوں کی فائلوں تک مجھے رسائی دے دی گئی ورنہ صرف لیاقت لائبریری میں اس کی فائلیں دستیاب تھیں، لیکن اس میں صفحات کی اکثریت کٹی پھٹی ہوئی تھی۔"(17)

لیکن اب یہ سفر نامہ خرم سہیل کی کتاب رضا علی عابدی کی سوانح حیات میں موجود ہے۔ خرم سہیل نے بہت ہی محنت اور لگن کے ساتھ اس پر کام کیا اور اپنی کتاب میں درج کیا ہے، جس کو پڑھ کے ایسا لگتا ہے، جیسے یہ سارہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اگر قاری پڑھتے پڑھتے اپنی آنکھیں بند کرے تو سارا منظر سامنے آجائے اس سفر نامے کو عابدی صاحب نے "یورپ ایک صحافی کی نظر میں" کا عنوان دیا۔

پیرس (یورپ ایک صحافی کی نظر میں)

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

جرمنی (یورپ ایک صحافی کی نظر میں)

سوئزرلینڈ (یورپ ایک صحافی کی نظر میں)

ان سفر نامہ میں عابدی صاحب نے یورپ میں گزارے ہوئے شب و روز کی روداد لکھی ہیں۔

اس سفر نامے میں کتابیں گفتگو کر رہی ہیں اور وہ اشخاص محو گفتگو ہیں جنہوں نے ان خزینوں کی حفاظت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ کتابوں کی دنیا کا سفر نامہ میں اپنی کتاب کے دیباچے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہ وہ کتابیں ہیں۔ جو آج ہیں اور شاید کل نہ ہوں اور یہ ان بے شمار کتابوں کے مزار ہیں جو خاک کی صحبت میں رہتے رہتے خود بھی خاک ہو گئیں ایسی خاک جس سے اب کوئی شگوفہ نہیں پھوٹے گا۔"(18)

دل سے دل کو راہ 1986ء میں شائع ہونے والی عابدی صاحب کی کتاب "کتب خانہ" کے دیباچہ میں ان کا قلم خیالات کو کچھ یوں تراشا ہے پرانی کتابوں کی بات 1975ء کے شروع میں یوں چھڑی تھی کہ بی بی سی، لندن کی اردو سروس نے اس وقت "کتب خانہ" کے عنوان سے پہلا سلسلہ وار پروگرام نشر کیا تھا۔

خرم سہیل نے عابدی صاحب کی بچوں کے لیے لکھی گئی 16 دلچسپ کتابوں کے احوال کا ذکر کیا ہے اور کتابوں کا مختصر تعارف بھی لکھا ہیں، جن سے ہمیں عابدی صاحب کے اندر بسنے والے لکھاری کا پتہ چلتا ہے۔

پنجاب حکومت کے محکمہ تعلیم کے لیے تصنیف کردہ کتابیں:

چوری چوری چپکے چپکے (تدریسی)

بندر کی اب پ (تدریسی)

پہلی گنتی (تدریسی)

گنگنا تا قاعدہ (تدریسی)

کمال کے آدمی (تدریسی)

قاضی جی کا اچار (کہانیاں)

نٹ کھٹ لڑکا اور دوسری نظمیں (نظمیں)

فکشن نگاری میں عابدی صاحب کی کہانیوں کے دو مجموعے ہیں عابدی صاحب نے فکشن کے شعبے میں افسانہ نگاری کے میدان کو اپنے لیے منتخب کیا۔ ان کے دو افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے پہلا مجموعہ "اپنی آواز کے نام" سے 2003ء میں اور دوسرا مجموعہ "جان صاحب" 2009ء میں شائع ہوا۔ پہلے مجموعے میں 16 افسانے ہیں دوسرا مجموعہ 15 کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں اور کہانیوں میں ویسے ہی روانی ہے جو ان کی تحریروں کا خاصا ہے۔

- پہلا مجموعہ۔ اپنی آواز سولہ کہانیاں کی ترتیب
- نام چھپانے کا موسم
- اپنی آواز
- کھوٹے داد
- مہر جو اس کی ہو وے
- ایک جیسی گھڑی
- دل ہی دل میں

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615
Vol. 7 No.1 2024

- مشکوک سی رغبت
- بہار کا بھید
- شاہ صاحب کا کمال

ان سب کہانیوں کا مختصر تعارف اس کتاب میں ہے۔

دوسرا مجموعہ۔۔۔جان صاحب پندرہ کہانیوں کی ترتیب

- ایک قطار کی کہانی
- میر صاحب کا پاگل پن
- میرا بچہ
- ونس مور
- گریڈ 9 کا سپیرا
- جان صاحب
- چوہدری عبدالہادی کا آختہ
- خلیل خاں کی سوانح

عابدی صاحب کی فکشن اور نان فکشن تحریریں پڑھنے کے بعد یہ انداز ہوتا ہے، اگر انسان کا ذہن متحرک ہو اور شخصیت میں توازن ہو اور دنیا کو دیکھنے کے فن سے آشنا ہو تو پھر ایسی نثر تخلیق ہوتی ہے، جس سے عابدی صاحب متعارف کرواتے ہیں۔ یہ تحریریں اپنے اندر ایک سوز و گداز رکھتی ہیں ان کے لکھے ہوئے کردار ہماری زندگیوں سے قریب ہیں نان فکشن موضوعات، سفر نامے، کتابوں کا احوال اور شخصیات کی خاکہ نگاری بھی ہمارے ذہن کے دریچے وا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں قاری کو نثری اور تخلیقی طلسم میں گم کر دیتی ہیں۔

عابدی صاحب ے غیر مطبوعہ مضامین اور خطبات بھی لکھے عابدی صاحب نے جو مضامین لکھے اس میں انہوں نے مختلف علمی و ادبی موضوعات کو قلم بند کیا 1962ء میں جنوری کے مہینے میں عابدی صاحب نے ایک مضمون بارہ سو سال پرانی عورت کے عنوان سے لکھا۔ یہ ادبی نوعیت کی تحریر تھی اسی برس دسمبر میں انہوں نے معروف مصور جمیل نقش کے فن پر ایک تحریر ''نقش کے نقوش'' بھی لکھی دسمبر میں ہی ایک اور مضمون جس کا عنوان ''جدید سائنس نے روحوں کا وجود تسلیم کر لیا تھا۔'' 1964ء میں مارچ کے مہینے میں انہوں نے متحرک مصوری کے نام سے ایک مضمون لکھا چند غیر مطبوعہ مضامین پیش کیے:

اُردو کے عالمی مراکز

زبان اور صحافتی اندازِ بیاں

اُردو اور ذرائع و ابلاغ

چند غیر مطبوعہ خطبات جو عابدی صاحب نے مختلف مواقعوں تقریب میں خطاب کیے جون 2012ء کو آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں رضا علی عابدی کی کتاب ''کتابیں اپنے آباء کی'' کی تقریب رونمائی کا انعقاد کیا گیا شہید حکیم محمد سعید لیکچر سیریز میں خطاب ادارہ سعید ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان اور ہمدرد یونیورسٹی میں جون 2013ء میں لیکچر دیا، اس موقع پر عابدی صاحب نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

> ''اچھے لوگ تو یوں بھی یاد رہتے ہیں، ان کی باتیں اور ان کی حکمت یاد رہتی ہے حکمت پر مجھے یاد آیا کہ میں حکیم صاحب کا انٹرویو کر رہا تھا، تو انہیں میری ایک بات بہت پسند آئی۔ میں نے کہا کہ حکیم صاحب عجب زمانہ آگیا ہے، اب نسخے لکھنے والے یا

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

پڑیا باندھنے والے کو لوگ حکیم کہتے ہیں حکیم تو افلاطون اور ارسطو کو کہا جاتا تھا وہ خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ نے خوب کہا حکیم صاحب جب بھی لندن تشریف لائے، بی بی سی ضرور تشریف لاتے اور مجھ سے ملنے ضرور آتے تھے۔"(19)

تہذیب فاؤنڈیشن کی تقریب سے بھی عابدی صاحب نے خطاب فرمایا جون 2013ء میں کراچی میں قائم ایک ثقافتی تنظیم "تہذیب" نے انہیں لندن میں ایک پروگرام میں مدعو کیا۔

عابدی صاحب نے خاکہ نگاری اور کالم نویسی میں بھی بڑی مہارت دکھائی عابدی صاحب نے جتنے خاکے لکھے، مضمون نگاری کی اور دوسرے لکھنے والوں کی تقاریب میں تقاریر کیں۔ ان سب کو ایک ہی کتاب "جانے پہچانے" میں یکجا کر دیا گیا عابدی صاحب نے جن شخصیات کے خاکے لکھے یا مضامین رقم کیے ان شخصیات میں نامور شاعر، ادیب اور علما شامل ہیں، اس حوالے سے ان کی کتاب "جانے پہچانے" میں تفصیل سے یہ تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں خرم سہیل صاحب نے قارئین کی دلچسپی کے لیے چار مضامین شامل کیے ہیں۔

ممتاز مفتی کا خاکہ

اس خاکے میں عابدی صاحب نے ممتاز مفتی کی شخصیت کو انہی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ خاکہ عابدی صاحب کی راولپنڈی میں، روزنامہ جنگ میں ملازمت کے دنوں کی ہے۔ ممتاز مفتی ایک شام راولپنڈی کے پریس کلب میں آئے تھے۔ یہ مضمون اسی تعلق سے لکھا گیا عابدی صاحب نے یہ خاکہ ممتاز مفتی کے روبرو پڑھا۔ اس کو سننے کے بعد اس خاکے کے بارے میں ممتاز مفتی نے کہا تھا "یہ میرا اب تک کا بہترین خاکہ ہے" بزرگ مصنف کی تحریروں سے جو بن پھوٹا پڑتا ہے، اس کا نام ہے احمد فراز کا خاکہ شاعر ہی شاعر فراز ہی فراز کے نام لکھا ہے۔

محمد طفیل کا خاکہ وہ موت میں بھی نصیبے ور نکلے کے نام لکھا گیا۔ غالب کا خاکہ ہم بتاتے ہیں کہ غالب کون ہے یہ سب خرم سہیل کی کتاب میں موجود ہیں۔

عابدی صاحب کے کالم

عابدی صاحب نے نومبر 2012ء سے رزنامہ جنگ کے لیے کالم لکھنا شروع کیے عابدی صاحب نے اب تک 50 کالم لکھ چکے ہیں ان میں سے 6 کا انتخاب کر کے خرم سہیل نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں:

دائرہ مکمل ہوتا ہے (9 نومبر 2012ء)
نئے ٹھگ (22 مارچ 2013ء)
نقل کرنے کو بھی نیر چاہیے (26 اپریل 2013ء)
ڈاک کے ٹکٹ برابر اچھی خبر (14 جون 2013ء)
دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں (12 جولائی 2013ء)
عالمی عدالت کے پچھواڑے راگ باگیشری (6 ستمبر 2013ء)

دائرہ مکمل ہوتا ہے

پورے بچپن برس ہوئے، سال کے یہی آخری مہینے تھے جب میں روزنامہ جنگ، کراچی سے وابستہ ہوا تھا۔ سنہ 1857ء کی جنگ آزادی کی صد سالہ تقریب منائی جا رہی تھی اور سوویت یونین کا پہلا مصنوعی سیارچہ اسپوٹنک خلا میں گیا تھا۔ جس دنیا کو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے اُس کی یاد کچھ نیم دلی سے منائی گئی تھی اور جس خلائی دوڑ کا آغاز ہو رہا تھا اُس کی دھوم مچی تھی۔ میں نے ایسی فضا میں اپنی عملی زندگی شروع کی تھی اور کچھ خبر نہیں تھی کہ میری پرواز مجھے کہاں لے جائے گی۔ آج جب ادارۂ جگ نے یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ میں اُس پرانے تعلق کی تجدید کروں اور اخبار کے لیے کالم لکھوں تو جس خیال نے میرے وجود میں سرشاری بھر دی وہ ایک جملے میں بیان ہو سکتا ہے۔ میں بے شمار قارئین سے بات کر سکوں گا۔ ابلاغِ عامہ سے وابستہ لوگوں کے لیے سب سے زیادہ سکون بخش یہی احساس ہوتا ہے۔

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

پاکستان کی دو جامعات میں عابدی صاحب پر ایم فل کے تحقیقی مقالے مکمل کر لیے گئے۔ان جامعات میں ملتان کی بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی اور سرگودھا یونیورسٹی شامل ہے۔

بہاولپور کی اسلامیہ یونیورسٹی نے رضا علی عابدی صاحب کو ان کی خدمت کے سلسلے میں اعزازی سند سے نوازا۔چوہدری محمد سرور گورنر پنجاب وچانسلر اسلامیہ یونی ورسٹی بہاولپور نے،پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار وائس چانسلر کی سفارش پر رضا علی عابدی کو پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری ان کی نشریات کی دنیا، صحافت اور ادب کے میدان میں طویل اور شاندار خدمات کے اعتراف میں دی گئی عابدی صاحب نے اس موقع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

> ''اُردو زبان نہیں ایک معجزہ ہے، جتنی زیادہ آسان، سہل، سلیس اور رواں اردو لکھی جائے گی، اتنی ہی فروغ پائے گی۔اردو ایک عالمی زبان ہے اور دنیا کے ہر کونے میں اردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ موجود ہیں۔''(20)

خرم سہیل نے عابدی صاحب کو ہیرو کے طور پر ہمارے سامنے لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے خرم صاحب نے عابدی صاحب کے زندگی کے ہر صفحہ کو کھولنے کی پوری کوشش کی ہے چاہے وہ ان کے خط ہو یا مطبوعہ کتب، خرم صاحب نے عابدی صاحب کی پوری زندگی ہمارے سامنے کھول کے رکھ دی۔ایک خط خرم صاحب نے عابدی صاحب کا اپنی کتاب میں شامل کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عابدی صاحب کو ہر خاص اور عام آدمی جانتا تھا۔ہر کسی کے دل میں گھر کیا ہوا ہے، یہ خط ڈیرہ اسماعیل خاں کی جیل سے ایک قیدی نے لکھا، جس میں اس نے اپنے دل کی باتیں لکھی ہیں لکھا کہ کاش کبھی آپ پاکستان آئیں، تو ہماری جیل کا بھی دورہ کریں۔اتفاق سے جب عابدی صاحب آئے، تو ان کو وہ قیدی نہیں ملا جس نے خط لکھا تھا کیونکہ اس نے خط میں اپنا نام نہیں لکھا تھا۔

پولیس والوں نے کہا کہ چونکہ اس قیدی نے جیل کے قانون کے برخلاف یہ خط اپ کو لکھا، لہٰذا وہ کبھی نہیں مانے گا۔عابدی صاحب کو افسوس ہی رہا کہ وہ اس جیل میں جا کر بھی اس قیدی سے نہ مل پائے۔اس قیدی نے اپنے خط میں عابدی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ یوں اپنے جذبات کا اظہار کیا:

> ''میں 25 سالہ قیدی ہوں۔یہاں جیل میں پانچ سالوں سے بی بی سی کی خبریں اور آپ کا پروگرام شوق سے سنتا ہوں آپ پاکستان کے جو مختلف شہروں کا دورہ کر رہے ہیں، مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ ڈیرہ اسماعیل خان کا بھی دورہ کریں گے۔ہم سب قیدی آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں میں اس خط میں اپنا نام ظاہر نہیں کر رہا، کیونکہ جیل میں خط لکھنے پر سزا ملتی ہے، ہم آپ کے جیل کا دورہ کرنے پر مشکور ہوں گے۔''(21)

خرم سہیل نے تین اہم انٹرویو کے اقتباس بھی اس کتاب میں لکھے بی بی اُردو سروس کے انٹرویو، انگریزی روزنامہ ڈان کے انٹرویو، اردو روزنامہ ایکسپریس کے انٹرویو لندن میں بسر کیے 40 برسوں کے متعلق ایک مکالمہ بھی اس کتاب میں ملتا ہے جس میں عابدی صاحب نے بتایا کہ 63 برس قبل اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ 1951ء میں ہندوستان سے ہجرت کی اور پاکستان آئے 1972ء میں بی بی سی کی ملازمت کے سلسلے میں پاکستان سے برطانیہ چلے گئے وہاں پہلے تو پانچ سال کا نٹریکٹ تھا لیکن پھر ایسا کنٹریکٹ سائن کر لیا، جس میں ریٹائرمنٹ تک وہاں ہی رہ سکتے تھے پھر انہوں نے پچھلے وطن کو ترک کر کے ایک نئے وطن کو اپنا لیا۔اس فیصلے کو ان کے بچوں نے بھی خوشی سے قبول کیا۔

اس کتاب کے آخر میں خرم سہیل صاحب نے عابدی صاحب کے بچپن سے لے کر موجود عہد تک کی ترتیب سے تصاویر لگائی ہے اور ہر دور کی تصویر کے ساتھ ساتھ وضاحت بیان کی ہیں اور چند تصاویر میں خرم سہیل اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ رضا علی عابدی کے ساتھ بھی نظر آتے ہیں۔ان تصاویر میں عابدی صاحب کے اہلِ خانہ اور کچھ پیشہ ور دوست نظر آتے ہیں۔

عابدی صاحب کی تحریروں کی طرح ان کی شخصیت بھی انتہائی سہل اور رواں ہے یہی وجہ ہے کہ زمانہ طالب علمی سے لے کر پیشہ ورانہ ادوار تک ان کے بے شمار دوست بنے۔مداحوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔پاکستان میں یہ خوش قسمتی بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے کہ وہ بیک وقت عوام اور خواص میں یکساں طور پر مقبول ہوں، لیکن عابدی صاحب پر قدرت کا خاص کرم ہے۔خرم سہیل کی کتاب پڑھ کے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر باعلم اور بلند مرتبہ شخصیت ہیں، لہٰذا ایسے تہذیب یافتہ شخصیات کے علم سے ہمیں بھی فیض یاب ہونا چاہیے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615
Vol. 7 No.1 2024

حوالہ جات

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2018ء، ص140

۲۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، 2018ء، ص107

3۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، سوانح نگاری کیا ہے؟ مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتبہ: فرمان فتح پوری، ص316

4۔ صدف نقوی، ڈاکٹر، گوہر ادب، فیصل آباد: مثال پبلشرز، 2019ء، ص113

5۔ شاہ علی، سید حالی اور شبلی (سوانح نگار کی حیثیت سے)، مشمولہ: اُردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتبہ: فرمان فتح پوری، ص340

۶۔ خرم سہیل، رضا علی عابدی (قلم سے آواز تک) سوانح حیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2014ء، ص18

۷۔ ایضاً، ص27

8۔ ایضاً، ص38

9۔ ایضاً، ص39

10۔ ایضاً، ص40

11۔ ایضاً، ص42

12۔ ایضاً، ص45

13۔ ایضاً، ص48

14۔ ایضاً، ص112

15۔ ایضاً، ص149

16۔ ایضاً، ص150

17۔ خرم سہیل، ٹیلی فونک رابطہ، 23 تاریخ بروز منگل، 12 بج کر 45 منٹ

18۔ خرم سہیل، رضا علی عابدی (قلم سے آواز تک) سوانح حیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2014ء، ص215

19۔ ایضاً، ص375

20۔ ایضاً، ص317

21۔ ایضاً، ص324